

## قسط نمبر 4

ادا کو ایک ہائی ٹی کا آرڈر ملا تھا۔ کام زیادہ تھا۔ اس نے تارا کے ساتھ اپنی میڈ کو بھی روک لیا۔ اور اب باہر برآمدے میں بیٹھی وہ تینوں کبابوں کے مسالے سے ٹکیاں بنا رہی تھیں..... موبائل پر گانے لگا رکھے تھے اور وہ تینوں ہنستے ہوئے باتیں کرتے ہوئے اپنے کام سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھیں۔

عبدالملک گھر آئے تو سیدھی نظر ان پر پڑی۔

ان کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے۔

ابو کو دیکھ کر احتراماً ادا نے الٹے ہاتھ سے، انگوٹھے سے اسکرین کو ٹچ کرتے ہوئے گانا بند کر دیا۔

اس کے ہاتھ سنے ہوئے تھے۔

”ادا! کام سے فارغ ہو کر ذرا میرے کمرے میں آنا.....“ ان کے پاس ذرا سارک کر کہہ کر وہ

اندر چلے گئے۔

”کیا کیا ہے اب؟“ تارا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اس انکار کے بعد تو کچھ بھی نہیں کیا..... اب اللہ جانے.....“ ادا نے کندھے اچکائے۔

”ابو خفا سے لگے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے.....“

”آپی! ایسا کریں آپ جائیں..... میں اور سعدیہ یہ بنا لیتے ہیں۔“ تارا نے اسے اٹھایا۔

”معلوم نہیں کیا بات ہے۔“ ادا سے زیادہ تارا کے چہرے پر تفکر نظر آیا۔

”اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ اسے تسلی دیتے ہوئے

اس کے اپنے دل میں کھد بُدی ہوئی تھی۔ ابونے اسے ایسے کیوں بلایا تھا؟

☆.....☆.....☆

اتنی خنکی بھرے موسم میں شال کی بکل مارے، چھت پرواک کرتے ہوئے وہ بہت دلگرفتہ تھی۔  
ابو کو اس کے کام پر اعتراض تھا۔

اور یہ اعتراض اب ہی کیوں سامنے آیا؟

شال کی بکل کو اور لپیٹتے ہوئے، چہرہ اٹھا کر چاند کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن سے ابو کی باتیں  
نہیں جا رہی تھیں۔

”میں نے سوچا دو چار دن کی بات ہے۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، اچھا ہے اس مصروفیت سے  
تمہارا دل بہل جائے گا۔ تم اس فیز سے نکل آؤ گی۔ ویڈیو تک تو ٹھیک تھا، مگر یوں کھانے بنا بنا کر  
بیچنا..... ادا! ہماری کوئی عزت ہے، کوئی مقام ہے معاشرے میں..... لوگ کیا کہیں گے؟“

تو یہ بس ایسا ہی ایک فیور تھا جو ہر اس بچے کو دیا جاتا ہے جس سے کوئی چیز چھن جائے، کوئی حادثہ  
رونما ہو جائے اور بس..... اور وہ کیا سمجھی.....؟ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے جا رہی ہے..... گردن  
نیچے کو گرا کر وہ ہنس پڑی، پر اس ہنسی نے آنکھ کو نم کر دیا تھا۔

ابو کی بات نے اس کا دل مسلاتھا۔ یہ ٹھیک ہے یہ کام محض مصروف ہونے، خود کو منفی سوچوں سے  
نکالنے کے لیے شروع کیا گیا تھا، مگر اب وہ اس میں جان لگاتی تھی..... شوق سے کرتی تھی۔ اتنی مشکل  
سے اس نے ویڈیوز بنانا، ایڈٹ کرنا، اپ لوڈ کرنا..... یہ سب سیکھا تھا۔ اور پھر اپنی ویڈیوز کو منفرد  
بنانا..... وہ کیسے کیسے نہیں پکی تھی..... اور آج کل تو اس نے spice chemistry کے نام سے  
ایک E-book ڈاؤن لوڈ کی ہوئی تھی۔

کچھ ”نیا“ ہی لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ انہیں کھینچ کر لاتا ہے۔ انہیں اس شے سے باندھتا  
ہے۔ اور اس کچھ ”نیا“ کرنے کی دھن نے اس سے کیا کیا نہیں کروایا تھا۔ کتنی کتنی بار وہ ایک ترکیب  
آزماتی تھی۔ کیسے کیسے طریقوں سے نہیں بناتی تھی۔ کتنی مغز ماری کر کے، تجربے کر کے وہ کوئی شے

بناتی تھی اور پھر hacks ڈھونڈنا..... سوچنا..... آزمانا کہ کیسے بازار جیسی شے گھر پر تیار ہوگی..... اور ابو کہتے تھے اسے یہ سب چھوڑنا ہوگا۔

اس کے گلے میں پھندا سا پڑا تھا۔

اور وہ واقعی ہی یہ سب چھوڑنے والی تھی۔ وہاں ابو کے سامنے سر جھکائے بیٹھے ہوئے اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کے باپ نے کہہ دیا، سو کہہ دیا۔ وہ ایک فرمانبردار بیٹی تھی۔ وہ اپنی ذات سے، اپنے باپ کو دکھ دینا تو کبھی نہیں چاہتی۔ سو وہ سر جھکائے وہاں سے اٹھ گئی۔ اٹھی اور دروازے تک گئی۔ ناب پر ہاتھ رکھا اور.....

اندراک ”کیوں“ نے بڑی شدت سے سراٹھایا تھا۔

وہ چند لمحے ناب پر ہاتھ رکھے، ہونٹ سختی سے بھینے، سر نیہوڑائے کھڑی رہی..... اور پھر مڑی، سراٹھا کر باپ کو دیکھا۔ عبدالمالک کی آنکھوں میں یوں دیکھنے پر سوال اُٹھ آیا۔

”اگر میں اپنا موقف آپ کے سامنے بیان کروں تو..... ابو یہ گستاخی تو نہ ہوگی؟“ وہ ان سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں بیٹا! کہو۔“ اس کے یوں ملتجی لہجے میں کہنے پر ان کا دل پسینا۔ وہ ان تک آئی، ان کے پاس پیروں میں بیٹھتے ہوئے اس نے سر ان کے زانو پر رکھا۔ بے ساختہ عبدالمالک کا ہاتھ اس کے سر تک گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی لاڈلی تھی۔ ولید نے اس سے کیا کیا نہیں چھین لینا چاہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے کوئی بہت زور کی چھن ہوئی تھی۔ ان کے فرش گیلے پڑنے لگے۔

”ابو.....!“ بائیں ہاتھ سے اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

”کل ناں میں ایک بہت بڑی ڈیزائنر کا انٹرویو دیکھ رہی تھی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس نے کیسے کپڑے ڈیزائن کرنا شروع کیے تھے۔ وہ لنڈے سے کپڑے خرید کر لاتی تھی اور پھر ان کو ادھیڑ کر، ان کی سلائی، ڈیزائن سمجھتی تھی..... اور پھر ویسا ہی ڈیزائن خود بناتی تھی۔ اسی شے نے اسے آج ایک نامور ڈیزائنر بنا دیا ہے۔ آج اس کی کہانی کو سن کر بہت سے ہاتھ تالیاں بجائیں گے لیکن ایک وقت وہ بھی تو

ہو گاناں کہ جب یہ ہاتھ تالیاں نہیں بجاتے تھے..... اس کے یوں لنڈے سے کپڑے لانے، کپڑے سی کر بیچنے پر ان ہی ہاتھوں کی انگلیاں اس پر اٹھی ہوں گی۔ وہ ہی ہاتھ پنچے کی شکل ”ہا“ کے سے انداز میں لوگوں کے کھلے دہانوں کو ڈھانپتے ہوں گے۔ کتنی حقارت ہوگی ان کے لہجوں میں جب وہ اس کے بارے میں یہ کہہ کر بات کرتے ہوں گے۔ ”اچھا وہ..... وہ جو کپڑے سیتی ہے..... درزن ہے۔“ اور آج..... وہ ہی ہاتھ..... ٹھیک وہ ہی ہاتھ تالیاں بجاتے ہیں..... وہ ہی منہ تعریفوں کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ وہی ”ہا“ اب ”واؤ“ میں بدل گئی ہے۔ وہ ہی لوگ..... جواب اس کے ڈیزائن کیے کپڑوں کو بڑے فخر سے اپنے تن پر بجاتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ان کی گردنیں آسمان تک اٹھ جاتی ہیں..... انگلی اٹھنے سے تالی بجانے تک کے سفر میں وقت تو لگتا ہے ناں ابو.....! بہت کچھ سہنا پڑتا ہے..... یا پھر ہم ایسی کہانیوں کو بس fantasize کرتے ہیں اور بس..... حقیقت میں ہم، ہمارا معاشرہ..... ہمارے لوگ پست ذہنیت کے حامل ہیں..... کیا نہیں ابو.....؟“ اس نے سر اٹھا کر پوچھا تھا۔ اور ابو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ادانے ایک نم، بوجھل سانس خارج کی۔

پتا نہیں اب وہ کیا کہتے..... وہ اپنا موقف پیش کر آئی تھی۔

”نہیں..... میں یہ نہیں چھوڑ سکتی۔ بالکل بھی نہیں..... مجھے یہ کرنا ہے۔ مجھے کامیاب ہونا

ہے۔“ گردن اٹھا کر، ہاتھ سینے پر باندھے، چاند کو تکتی وہ ایک پر عزم، باہمت عورت لگتی تھی.....

وہ، وہ ادا تو نہ لگتی تھی کہ جسے ولید نے برباد کر دینا چاہا تھا۔ وہ بربادی کو بھی برباد کر دینے والی لگتی

تھی۔ اس چاند کی 14 تاریخ کو اس نے اپنے اندر پلتے دکھ کو ایک بھیڑیے میں بدلتے دیکھا تھا جو ہر

مشکل کو، ہر مصیبت کو، ہر رکاوٹ کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے فریزر کھولا اور تذبذب میں کھڑی رہی۔ اندر ٹرے میں قطار میں شامی کباب رکھے تھے

جن کو پولی تھن شیٹ سے کور کیا ہوا تھا۔ نچلا ہونٹ، اوپر دانتوں تلے دباتے ہوئے وہ کرنے، نہ کرنے

کی کشمکش میں تھی..... اور پھر اس نے فریزر بند کر دیا۔ پھپھڑوں میں بھرپور ہوا بھر کر اس نے فضا میں سانس خارج کی..... چہرے پر ہاتھ پھیر کر نہ جانے کون سا تاثر زائل کرنا چاہا۔ کچن کی کھڑکی سے ایک نظر باہر برآمدے میں ڈالی جہاں عبدالملک اخبار کے مطالعے میں مصروف تھے۔ ذہن میں جملوں کی ترتیب دہراتے ہوئے، ایک منطق کا سرا دوسری منطق سے ملاتے ہوئے، دلائل کی تہ جماتے ہوئے وہ ان تک آئی۔

”ابو.....!“ انداز سہا ہوا مگر قدم مضبوطی سے جمے ہوئے۔

”ہوں.....!“ انہوں نے ایک نظر اخبار سے ہٹا کر اسے دیکھا اور پھر اخبار میں گم ہو گئے۔

اس انداز پر اس کے کندھے ڈھلک سے گئے۔

”ابو! وہ جو ابھی آرڈر لیا تھا..... وہ پورا کر لوں؟ چیزیں ضائع ہوں گی..... اور پھر وعدہ کیا ہوا

ہے نا.....“ اسی ڈھلکے چہرے والے انداز میں اس نے پوچھا اور جواب کیا آیا۔

”ہوں.....!“

(کیا ”ہوں“..... وہ جھنجھلا گئی)

”کر لو۔“ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

”اپنا وعدہ پورا کرو۔“ کہہ کر پھر سے نظریں اخبار پر۔

اس نے منہ کھولا، کچھ کہنا چاہا۔ کم بخت آنسوؤں نے اس کا گلا بند کر دیا اور اس نے ہونٹ بھیج

لیے۔ وہ مڑ گئی تھی۔

”ادا.....!“ اس کے حرکت کرتے قدم تھمے۔

”انگلی اٹھنے سے..... تالی بجنے تک کے سفر میں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

اس کی سماعتوں نے کیا سنا؟ ہاں..... کیا سنا.....!

اس کی ناک میں کوئی شے تیز مرچ کی طرح گھسی اور پورے جسم میں پھیل گئی..... اس کی سانس

اوپر کو کھینچ کر رہ گئی۔ بے ساختہ اس نے گردن موڑ کر باپ کو دیکھا۔ اپنے منہ کو ہاتھ سے ڈھانپ کر، اس نے اپنی سسکی روکی..... سسکی تو رک گئی..... پر آنسو بہہ پڑے اور وہ بے آواز رو رہی تھی۔

ماں باپ سے بات کرنے کا فن، ہنر آنا چاہیے..... وہ نہیں مانتے، آپ کوشش جاری رکھیں۔

آرام سے، تمیز، فرمانبرداری سے..... منطق سے.....

کوئی تو دن آئے گا کہ جب بچے، والدین کی یا والدین بچوں کی بات سمجھ جائیں گے۔

انتہا پسندی کے فیصلے پھر انتہا ہی لاتے ہیں.....

بربادی کی انتہا.....



جائیداد کا بٹوارا کرنے کے لیے کچھ پیچیدگیاں تھیں۔ بخت ان کا بھتیجا بھی تھا اور ان کی بیوی کا بیٹا بھی۔ سو اس لحاظ سے وہ قانونی اور مذہبی دونوں صورت حال جاننا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قاضی صاحب کے دفتر کے چکر کچھ بڑھ گئے تھے۔ کبھی بخت ان کے ساتھ ہوتا، کبھی قاضی صاحب گھر چلے آتے اور کبھی بس قاضی صاحب اور عبدالرزاق ہی ہوتے۔ اسی دوران عبدالرزاق صاحب نے قاضی صاحب کی بیٹی مبشرہ کو بھی دیکھا تھا۔ اچھی بچی تھی۔ انہیں پسند آئی تھی۔ اس دن وہ اور بخت جب قاضی صاحب کے دفتر میں داخل ہوئے تو وہ وہاں سے جا رہی تھی۔ ذرا رک کر اس نے حال احوال پوچھا اور پھر بیگ کا اسٹریپ کندھے پر چڑھائے وہ بڑی عجلت میں نکلی تھی۔

”قاضی صاحب! ماشاء اللہ آپ کی بیٹی بھی law پڑھ رہی ہے۔“ بخت نے ان کے لیے کرسی گھسیٹی اور عبدالرزاق بیٹھتے ہوئے بولے۔

”ہاں جی! بس مکمل ہونے کو ہے اس کی اسٹڈیز..... بس جیسے ہی اسٹڈیز مکمل ہوگی، میں نے اس کی رخصتی کر دینی ہے۔“

”رخصتی.....؟“ عبدالرزاق چونکے۔

بخت اگر چونکا بھی تھا تو طاہرہ نے دیا۔

”جی عبدالرزاق صاحب! بچپن میں نکاح ہوا ہے مبشرہ کا اپنے تایا کے بیٹے کے ساتھ۔ بس اب جو پریکٹس کرنی ہوگی، شادی کے بعد ہی کرے گی۔“ کہتے ہوئے قاضی صاحب نے متعلقہ فائل کھولی اور اس جواب پر عبدالرزاق کو بڑے زور سے ہنسی آئی۔ وہ ہنسنے تو نہیں، بس مسکرا کر بخت کو دیکھا اور بخت نے یوں پوز کیا جیسے کندھے اچکا کر کہتا ہو..... "what".....

اور پھر جب تھوڑی دیر بعد قاضی صاحب اپنے کسی فون میں بڑی ہوئے تو عبدالرزاق اس کی جانب جھک کر رازداری سے بولے۔

”لے بھئی، ادھر تو سر منڈواتے ہی اولے پڑ گئے۔“

وہ بھی ایسی ہی رازداری برتتے ہوئے بولا۔

”کوئی نہیں بابا! پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ۔“

وہ سیدھے ہوئے، اسے دیکھا اور بولے۔

”اللہ میرے دل کی مراد پوری کرے۔ جا تجھے ساری ایسی ہی نکاح شدہ لڑکیاں ملیں۔“ اور وہ بے ساختہ ہی ہنس دیا۔

☆.....☆.....☆

”السلام علیکم! مس ادا عبدالمالک بات کر رہی ہیں؟“

اس کے ہیلو کے جواب میں پوچھا گیا تھا۔

”جی، بات کر رہی ہوں۔“

”میں بخت ٹریول این ٹور سے بات کر رہا ہوں۔ بخت عبدالرحمن صاحب کا منیجر ہوں۔ میم!

ہمیں ایک آرڈر بک کروانا ہے۔“ اور ادا کے تو مانوسر پر لگی اور تلوے پر بھی نہ بچھی۔ غضب کا طیش چڑھا تھا اسے.....

”میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کا آرڈر بک نہیں کر سکتی۔ اس بات سے اپنے CEO صاحب

کو ضرور مطلع کیجیے گا۔ خدا حافظ!“ تنک کر کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔

”میرے خدا! اس شخص کے تو دیدوں کا پانی ہی مر گیا۔ خود سے نہیں کہہ سکتا تھا مجھے..... یوں اب آفیشلی اپروچ کرے گا مجھے۔ انگریز کی اولاد نہ ہو تو..... فیملی میں نہیں رہا ناں..... تو اسے معلوم ہی نہیں کہ خاندان والوں سے کیسے برتا جاتا ہے۔ کولڈ بلڈڈ..... thick skinned۔“ اس نے عرصے بعد اسے، اسی لقب سے مخاطب کیا تھا۔

”مانا کہ ہمارے درمیان اب کچھ نہیں ہے مگر بخت عبدالرحمن تم میرے ایک تایا کے بیٹے ہو اور دوسرے تایا کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ اسی ناتے سے ہم ایک ہی blood line شیئر کرتے ہیں اور بیٹا! دیکھنا تو سہی یہ بات تمہیں میں کتنی اچھی طرح سے سمجھاتی ہوں۔“ طیش تھا کہ کم ہو کر نہیں دے رہا تھا۔

”لو اب ذرا ٹریلر تو ملاحظہ کرو۔“ دانت پیس کر کہتے ہوئے اس نے دور پھینکے جانے والا فون اٹھایا اور تایا کو کال ملانے لگی۔ اس رویے نے مانو دل پر چوٹ کی تھی۔

”اب ایسا بھی کیا کہ ہم تم شناسائی سے بھی گئے۔ میں کوئی xyz تھی کیا؟“ ادا نے سوچا۔

”آپ کا بیٹا بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے ناں تایا ابو!“ کال پک ہوتے ہی وہ یوں بھڑکتے ہوئے بولی کہ عبدالرزاق بوکھلا گئے۔

”کیا ہوا بیٹی؟“ وہ پریشان ہو کر بولے تھے۔

اور نمک کے ساتھ مرچ مسالا کس تناسب سے لگایا جاتا ہے، یہ تو وہ بڑے اچھے سے جانتی تھی۔ ذائقہ گھول دیتی تھی..... کیا کھانے میں..... کیا بات میں۔ اور جب اس نے فون بند کیا..... ہا..... سوچ کر ہی دل پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ بڑے شاہانہ انداز میں کرسی پر ٹیک لگا کر، ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی۔

”بچو! مجھے تم نے غلط جج کیا۔ چلو آج تم کو میرے ایک اور ٹیلنٹ کی بھی خبر ہوگی۔“ یہ سوچ کر وہ بڑے زور سے ہنسی تھی۔

تارا اس کے کمرے کے باہر سے گزری۔ اسے یوں ہنستے دیکھ کر ذرا پیچھے ہو کر رہی۔

”ہیں! آپ یوں اکیلے اکیلے تو پاگل ہنستے ہیں..... نہیں؟“ وہ سخت تعجب کا شکار تھی۔

ادا نے ہنستے ہوئے اسے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا۔ تارا نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا

اور پھر کندھے اچکا کر آگے بڑھ گئی اور پھر ہنستے ہنستے ایک دم اس کے لبوں کی ہنسی ماند ہوئی۔  
 ”تم نے ہی تو سکھایا ہے بخت عبدالرحمن! کہ ہر پہنچنے والا آزار قابلِ معافی نہیں ہوتا۔ تم نے اتنی غیریت کیوں برتی؟ میرے ساتھ یوں مت کیا کرو کہ میرے پیروں تلے کی زمین سرکے لگتی ہے۔ سب برداشت ہے پر یہ نہیں۔ یہ نہیں بخت عبدالرحمن..... ہر گز نہیں!“  
 معلوم نہیں کیوں وہ اتنی حساس ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ اسی دن کی شام ہے۔ بخت نے چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھا اور نظر دوڑائی مگر نظر سرخرو ہو کر لوٹ نہ پائی۔ اسی لیے سامنے بیٹھی تارا نے اپنی پوری بتیسی دکھانا فرض عین سمجھا تھا۔  
 ”تارا!“

”جی بخت بھائی!“ اور تارا کا لہجہ تازہ تازہ شیرینی میں ڈبکی لگا کر آیا تھا۔

”فائرنگ کے کس قدر چانسز ہیں؟“

”سو فیصد!“ وہ ڈیڈشیور تھی۔

”دشمن کدھر کومور چہ بند ہیں؟“

”جوان کا بیس کمپ ہے، وہیں..... (اشارہ کچن کی طرف تھا) میری مانیں تو دشمن کی کچھار میں

گھسنے کا رسک نہ ہی لیں۔ کسی کو ثالث ٹھہرا لیں۔“ تارا کو ایک دم بخت کی باجی بننے کا شوق چڑھا تھا۔

”مذاکرات کے ذریعے معاملہ حل نہیں ہو سکتا کیا؟“ محفوظ ہوتے ہوئے اس نے کہنی صوفے

کی سائیڈ پر ٹکائی۔

”چانس لینے والی بات ہے۔“ تارا نے بڑے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔ بخت ہلکا سا سر جھٹک

کر مسکرایا اور اس طرف متوجہ ہوا جہاں اس کے بابا، عبدالملک اور رقیہ بیٹھی تھیں۔

”آئی! ادا سے ایک آرڈر کے سلسلے میں بات کرنی تھی۔ اسے بلوادیں ذرا۔“ اس کے یوں

براہ راست کہہ دینے پر تارا کو ایک جھٹکا لگا۔

وہ بخت عبدالرحمن تھا، چور راستے اس کے لیے نہیں تھے۔

”ادھر کچن میں ہے۔ کھانے کا انتظام کر رہی تھی۔ جاؤ تارا! آپی کو بلا کر لاؤ۔“ اسے جواب دیتے ہوئے انہوں نے تارا سے کہا۔

”نہیں، اسے ڈسٹرب نہ کریں۔ میں وہیں چلا جاتا ہوں۔“

”آ.....“ کچھ کہنے کے لیے رقیہ نے منہ کھولا مگر کچھ سوچ کر ”اچھا ٹھیک ہے“ کہہ کر چپ ہو گئیں۔ کچن سے ذرا فاصلے پر پہنچ کر وہ پہلے کھنکھار اور پھر خود پیچھے رہ کر ہاتھ بڑھا کر اس نے دستک دی۔ گھر، بندے کا کمفرٹ زون ہے۔ سو وہ کسی بھی حال یا حلیے میں پایا جاسکتا ہے۔ ادا نے اس کے کھنکھارنے پر ہی گلے میں پڑا دوپٹا سلیقے سے اوڑھتا تھا مگر مڑی نہیں۔ اپنے کام میں مصروف رہی۔

”السلام علیکم!“ کندھا چوکھٹ سے ٹکاتے ہوئے، بازو سینے پر باندھے، دونوں پیروں کا کراس بنا کر کھڑے ہوتے ہوئے نہایت متبسم لہجے میں سلام آیا تھا۔

”وعلیکم.....! جی؟“ اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے، مڑے بنا، بے پناہ مصروفیت کے ساتھ، انتہائی اجنبی لہجے میں جواب آیا تھا۔

اور وہ سر جھکا کر ہلکے سے ہنس دیا۔ یوں جیسے مسکراہٹ کو ہنسی میں بدلنے سے روک نہ پایا ہو۔

”اس میں اتنا برا منانے والی کیا بات تھی؟ بہت سے لوگ آفیشلی اپروچ کرتے ہیں آپ کو..... میں نے کر لیا تو کیا برا ہوا؟“

اس بات پر دانت پیستے ہوئے ادا نے کس کر چیخ ہانڈی میں چلایا۔

”میرا نہیں خیال آج کی تاریخ میں میری کسی سے اپائنمنٹ تھی۔ آپ سے تھی کیا؟“ وہ رخ موڑ کر ایسے دل جلانے والے انداز میں مخاطب ہوئی تھی کہ کوئی اور ہوتا تو جل کر سیاہ کوئلہ ہو جاتا مگر وہ.....

دوا انگلیاں ہونٹوں پر رکھے، انگوٹھے پر ٹھوڑی ٹکائے، اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ جیسے اور گہری ہوئی۔

”اپائنمنٹ تو نہیں تھی..... چلیں آپ دے دیں۔ آج کی..... ابھی کی۔“

”اتنی فارغ نہیں ہوں میں۔“ وہ مڑ کر، بل کھا کر بولی۔

”اچھا سوری! غلطی ہو گئی۔ پتا ہے مجھے کہ تم فیملی ہو..... اور فیملی کو.....“

”تمہیں معلوم تھا؟“ اس نے ترنت بخت کی بات کاٹی تھی۔ وہ حیران تھی۔

”گر نہیں بھی تھا تو یہ جو آج پیشی ہوئی، اس کے بعد کسے معلوم نہیں ہونا تھا۔“ بخت نے بڑی

خوب صورتی سے بات گھمائی تھی۔

وہ کچھ بول نہیں سکی۔ خاموش نظروں سے اسے تکتی رہی۔

”تم نے یہ ارادتا کیا ناں؟ تم مجھے فائدہ پہنچانا چاہتے تھے ناں؟ اور تمہیں لگتا ہے کہ اس طرح

سے تم مجھے فائدہ تو کیا نقصان بھی پہنچاؤ تو میں کبھی قبول کروں گی.....؟ اتنی ارزاں نہیں ہوں میں

بخت!“ دکھ جیسے نمی کی طرح آواز میں گھلا تھا۔

بخت نے تکلیف سے آنکھیں بند کیں۔

”کس نے کہا کہ تم ارزاں ہو؟“

وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے جوتے کی ٹوہ سے زمین پر نادیدہ لائنز کھینچ رہا تھا۔

”کوئی اپنا دل کھول کر کیسے دکھائے؟“

اور ادا کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ کیا تھا اس جملے میں کہ اس کے جسم کا رد عمل actual تھا۔

اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے اور منہ تو بخت عبدالرحمن کا بھی کھل گیا۔ جسے اس

نے گلا کھنکھارنے کے بہانے ہاتھ سے ڈھانپا تھا۔ یہ کیا کہہ دیا..... بخت عبدالرحمن یوں بے قابو کس

طرح سے ہو سکتا ہے۔

”تو پھر کب دے رہی ہیں آپ مجھے اپائنٹ تاکہ میں آپ سے لنچ کا مینیو ڈسکس کر سکوں؟“

سراٹھا کر، سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بنا کسی تاثر کے، رسمی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اس

نے یوں ادا سے پوچھا کہ وہ الجھ کر رہ گئی۔

چند لمحے پہلے جو جملہ اس نے کہا تھا، اس کا مطلب کیا تھا۔ کیا وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ ادا واقعی

ارزاں نہیں ہے یا پھر.....

”ارے نہیں! اس کا مطلب یہ ہی تھا کہ وہ اپنی بات میں سچا ہے۔ اس نے ادا کو لیٹ ڈاؤن نہیں کیا..... اور بس۔“

بخت عبدالرحمن اگر بے قابو ہو سکتا ہے تو وہ حالات کو قابو کرنا بھی جانتا تھا۔  
”ابھی کھانا کھا لو تو کرتے ہیں بات۔“ مڑ کر کہتے ہوئے ادا کا لہجہ بالکل ہموار تھا۔

☆.....☆.....☆

"The aroma of food is so appetizing..... savoury"

ہینری بینجمن نے بات کرتے کرتے ایک دم رک کر، ناک سے خوشبو کو اندر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"It sounds you have a good taste." بخت نے مسکرا کر جواب دیا۔

"Yes! I do have....."

"So! Let's give it a try....."

یہ کہہ کر بخت کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اٹھا اور اٹھ کر ڈرائنگ روم سے ڈائننگ تک آیا۔  
ڈرائنگ روم اور ڈائننگ کو باریک شیفون پردے ایک دوسرے سے جدا کرتے تھے۔

بخت نے دونوں ہاتھوں سے پردے پیچھے کیے۔ گرم گرم لذیذ کھانے کی مہک پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی سی کھانے کی میز پر کھانا نہایت سلیقے سے چنا گیا تھا۔

”دلیم اسپاؤسی ہوتی ہے ادا! اس میں بہت سے مسالا جات کا استعمال ہوتا ہے۔ تم اس کا پیٹ خراب کرواؤ گی۔“

”پھیکی دلیم کا کیا ٹیسٹ ہو گیا بخت؟ تم یہ موقع ہاتھ سے گنواؤ گے۔“

”تو اسی لیے کہہ رہا ہوں ناں کہ دیسی چھوڑ و کچھ اٹالین، چائینز بناؤ۔“

”میں صرف دیسی کھانے بنا سکتی ہوں بخت! یہ اٹالین، چائینز not my cup of

tea..... اگر یہ ہی کھانا ہے تو کسی اچھے سے ریسٹورنٹ لے جاؤ ناں، میرا دماغ کیوں پکار رہا ہے۔“

اور بخت کے عین سامنے مٹی کے پیالوں میں سبھی دلیم کے اوپر براؤن فرائڈ پیاز، ادرک، تازہ دھنیا اور سبز کٹی مرچیں..... اور جس پلیٹ میں وہ پیالہ سجا تھا، اس میں لیموں کاٹ کر رکھا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر بخت کے حلق سے نیچے کچھ اتر ا۔

”کیا خراب ہوگا؟ میرا کنٹریکٹ یا ہینری کا پیٹ یا پھر دونوں ہی۔“

مینیو طے کرتے وقت کتنی بحث ہوئی تھی۔ یہ ادا کا آئیڈیا تھا کہ اگر فارنز کا گروپ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کا وزٹ کرنا چاہتے ہیں تو یقیناً وہ پاکستان کا سنگنچر فوڈ بھی کھانا چاہیں گے۔ سو انہیں سنگنچر فوڈ ہی کھانا چاہیے۔ اور وہاں میز پر دلیم کے ساتھ آلو گوشت، ہری مرچ اور ہرے دھنیے کی گارنشنگ کے ساتھ، مٹی کی ہانڈی میں سجا ہوا تھا۔ مٹر پلاؤ تھا اور مٹی کے پیالوں میں سبھی کھیر کہ جس کے اوپر زعفران کے رنگ کا گول ٹیکا سا بنا ہوا تھا۔ گارنش کے لیے پستے، بادام کی ہوائیوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ بخت ایک گہری سانس لے کر مڑا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے افراد کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے ڈائنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جینٹلمین پلیز!“

وہ باتیں کرتے ہوئے، آگے پیچھے ڈائنگ میں داخل ہوئے۔ کرسیاں گھسیٹنے کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی ایک اور آواز بھی آئی تھی۔

"Nobody will start the meal!"

اچانک ہینری نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہاں خاموشی چھا گئی اور بخت کی سانس خشک ہوئی۔

"First I've to take pics."

"Oh Ben.....!"

وہاں کئی آوازیں ابھری تھیں۔ Ben نے ایک ایک کھانے کی تصویر لی تھی اور جب ہینری نے دلیم کا پیالہ ختم کیا تو ایک دم اسے نوٹس ہوا کہ کنارے پر کچھ initials انگریز (engraved) تھے۔ اس نے ذرا سا پیالہ اوپر کر کے آنکھوں کے سامنے کیا۔ پورا نام پڑھنے کے لیے اسے پیالے کو گھمانا پڑا تھا۔

## K.W.A (Kitchen with Ada)

اس نے موبائل اٹھایا۔ پیالہ یوں رکھا کہ پورا نام تصویر میں آ سکے اور ایک کلک کی آواز آئی۔ جب بخت نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ پیالہ میز پر رکھ رہا تھا۔

"So how was the food?"

بخت کے پوچھنے پر ہینری نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"As I said..... savoury!"

اور بخت ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

ہینری بیخمن محض ایک ٹورسٹ نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

فون کی بیل پر وہ متوجہ ہوئی۔ اٹھا کر دیکھا تو بخت کا لنگ بلنک کر رہا تھا۔  
 ”تو بالآخر بخت عبدالرحمن کو ہماری یاد آ ہی گئی۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے انگوٹھے سے سوائپ کرتے ہوئے کال اٹھائی۔

”تمہیں کچھ بھیج رہا ہوں..... چیک کرو، ابھی کے ابھی۔“ اس کے بولنے سے بھی پہلے آگے سے بخت بہت تیزی سے بولا اور کال کٹ گئی۔ ادا نے حیران ہو کر فون کی اسکرین کو دیکھا اور ابھی حیرت دور نہیں ہوئی تھی کہ ساتھ ہی دو تین پیغامات واٹس ایپ آئے تھے۔ اس نے ایپ کھول کر چیٹ دیکھی اور جب اس نے چیک کیا کہ بخت عبدالرحمن نے اسے کیا بھیجا تھا تو..... تو فون اس کے ہاتھ سے نیچے جا گرا۔ دونوں ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپنے ایک دم آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرے تھے۔  
 ”بخت.....!“

☆.....☆.....☆

آگسٹاوائٹ نے سانس روک کر ذی ٹی (ZT) کو دیکھا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی..... کیا؟ آگسٹا کی سانس ویسے ہی ذی ٹی کی ڈریسنگ دیکھ کر بند ہونے کو تھی۔ بھڑکتے ہوئے سبز رنگ کی اسکرٹ کے

ساتھ ویسی ہی جیکٹ اور ویسے ہی بھڑکتے سبز رنگ کے لانگ بوٹ..... آخر کو وہ ایک معروف ڈیزائنر تھی۔ ایسی ڈرینگ اس کا پہلا حق تھی لیکن ابھی موقع اس کی ڈرینگ میں الجھنے کا نہیں تھا..... جس طرح کی آگسٹا کی جاب تھی اس میں اسے ہر منٹ کے بعد چیلنجز درپیش ہوتے تھے مگر اس طرح کے چیلنجز..... جو دماغ کی چولیس تک ہلا دیں اور جن کا فوری کوئی حل ہو ہی نہیں سکتا ہو وہ یقیناً پھریوں ہی سانس بند کرتے ہیں۔ ذی ٹی تو کہہ کر فولڈنگ فین کھول کر چہرے کے قریب کیے تیزی سے جھلتے ہوئے کرسی پر نیم دراز تھی..... جبکہ آگسٹا منہ کھول کر اپنے باس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک میڈیا منیجمنٹ کی کمپنی تھی جن کے کلائنٹس ہائی پروفائل ہوا کرتے تھے۔ ذی ٹی بھی ایک ایسی ہی کلائنٹ تھی اور آگسٹا وائٹ..... اس کمپنی میں بطور میڈیا ایڈوائزر کام کرتی تھی۔

”مجھے ہارٹ اٹیک آجائے گا۔“

”آہی جانا چاہیے۔“ آگسٹا نے پہلو بدلتے ہوئے سوچا اور ذی ٹی کا نیچر اس کے ہائے وائے مچانے پر anti oxident water کے ساتھ اینٹی ڈیپریسینٹ دے رہا تھا۔

”او..... مائے گاڈ..... او..... مائے گاڈ!“ ذی ٹی نزاکت سے فین جھلتے ہوئے نزاکت سے ہی چلائے جا رہی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ ذی ٹی کی نئی کلکیشن لانچ ہوئی تھی۔ سوشل میڈیا کی کمپین بھی چل رہی تھی۔ وینیو تک فائل ہو چکا تھا۔ ڈیٹ بھی اناؤنس ہو چکی تھی۔ اور اب ذی ٹی کا کہنا تھا کہ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا ہے اور وہ زیادہ ڈیزائن نہیں کر سکی۔ اس کے پاس کل ملا کر محض تین چار ڈیزائن تھے.....

آگسٹا کا ذہن اتنی تیزی سے جمع تفریق کر رہا تھا کہ اتنی تیزی سے تو ذی ٹی کا دل بھی نہیں دھڑک رہا تھا۔

وہاں صرف آگسٹا ہی نہیں تھی، پوری میڈیا منیجمنٹ کی ٹیم تھی لیکن تشہیر کی ذمہ داری آگسٹا پر ہی تھی۔ سب ذہن جیسے ایک دم رک گئے تھے۔ کوئی سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔

”آہم.....!“ کمپنی کا ہیڈ کھنکھارا۔

”ایسا ہے مس ذی ٹی.....! ہمیں تھوڑا وقت دیں تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ اس سلسلے میں اب کیا کیا جا

سکتا ہے..... کوئی محفوظ راستہ ڈھونڈا جاسکتا ہے یا کچھ فیس سیونگ کی راہ اختیار کی جائے گی۔“  
 ”نو.....!“ اس بات پر ذی ٹی نے ایک لمبی سی نوکی اور منیجر کے کندھے پر جاگری..... اس کی سسکیوں کو سماعت نے خون کے گھونٹ پی کر ہی برداشت کیا تھا اور پھر جیسے ہی سب وہاں سے اٹھنے لگے تو.....

"Why don't we launch a limited edition?"

اور اس آواز پر ذی ٹی جھٹکا کھا کر سیدھی ہوئی۔

سب گردنوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"bitch!" ایک ایمپلائی نے دوسرے کے کان میں گھس کر کہا تھا۔

اس نے وہی کہا تھا کہ جس کے لیے وہ جانی جاتی تھی۔ ذی ٹی نزاکت سے تیز چال چلتی..... بل کھاتی، لہراتی اس تک آئی۔ اس کے دائیں بائیں گال کو بوسہ دیا۔

"You just saved me sweetie!"

اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ممنونیت سے دہری ہوتے ہوئے بولی۔

"It's my job honey!" آگسٹا وائٹ نے ہونٹوں کو دائیں سے بائیں حتی المقدور

پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔ ان کے پاس ابھی ایک ہفتہ تھا۔ سوشل میڈیا کمپین میں limited hashtag edition کا ایڈ کر کے وہ یہ کر سکتے تھے۔ اس طرح سے قیمت بھی وصول ہو جانی تھی، کلائنٹ بھی سیو (save) رہتا اور کمپنی بھی نقصان سے بچ جاتی۔

"bitch"..... اس سے جامع تعارف آگسٹا وائٹ کا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ ولید عبدالرزاق کی

امریکن بیوی تھی۔

☆.....☆.....☆

”تم مقدمہ کیوں نہیں کرتے ولید.....؟ ایسے تمہارا باپ تمہیں پراپرٹی کا شیر دینے والا

نہیں.....“ رات کا کھانا تیار کرتے ہوئے، ماتھے پر بل ڈالتے اس نے سلا دکاٹے ولید سے کہا تھا.....

ولید ایک امریکن یونیورسٹی میں لیکچرر تھا جبکہ بیوی میڈیا ایڈوائزر تھی۔ ان کی فیملی میں اضافہ ہونے والا

تھا۔ اسی لیے ان دونوں کو اس ”اضافے“ کے ”اخراجات“ کی فکر تھی۔ ان کے خیال کے مطابق کوئی اضافی آمدنی بھی ہونی چاہیے۔ اپنی تنخواہ سے وہ کچھ بچا نہیں سکتے تھے سو بہترین حل یہ نکالا تھا کہ جس کام میں آگسٹا ماہر تھی کہ ولید کا شیئر لیا جائے اور اسے کہیں انویسٹ کیا جائے..... وہ کیا ہے ناں کہ ایک جیسی روہیں ایک دوسرے کو تلاش کر لیتی ہیں، سوان کا بھی یہی حساب تھا۔

”تھوڑا سا انتظار کر لوہنی..... گھی اگر سیدھی انگلی سے نہ نکلاتو میں ٹیڑھی کرنا بھی جانتا ہوں۔ مجھے بس اپنے باپ کا لحاظ ہے۔ اس نکھٹو کے حوالے گھر، بزنس، پیسہ سب کیا ہوا ہے۔ مفت کا مال سمجھ کر ہڑپ کر رہا ہے اس کے تو حلق سے نکلاؤں گا میں..... بس میں چاہتا ہوں کورٹ میں جائے بنا اگر مسئلہ حل ہو سکتا ہے..... تو ہو جائے..... خواہ مخواہ کی درد سہی کیوں پالی جائے۔ میں نے پیغام تو بھیجا ہے۔ تھوڑا انتظار کرو، میں کورٹ کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس کے لیے مجھے پاکستان جانا پڑے گا اور ابھی میں یہ افورڈ نہیں کر سکتا۔“ وہ کٹنگ ٹرے سے سبزیاں ایک باؤل میں منتقل کرتے ہوئے بولا۔

”بے بی کے آنے سے پہلے..... ہمیں اس کے لیے کچھ نہ کچھ..... کہیں نہ کہیں انویسٹ کرنا ہے۔ ورنہ اخراجات کنٹرول نہیں ہو سکیں گے۔ تمہارا باپ نہ مانا تو.....؟“ نیکپن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے، وہ اب کچن شیلف سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

”تو..... ظاہر ہے کورٹ ہی جانا پڑے گا مگر میں حتی الامکان اس سے بچنا چاہ رہا ہوں..... تھوڑا انتظار کر کے دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے.....“

وہ کہتے ہیں ناں کہ ایک جیسی روہیں ایک دوسرے کو تلاش کر ہی لیتی ہیں تو کچھ ایسا ہی تھا۔ آگسٹا نے ایک گہری سانس بھر کر اسے دیکھا تھا۔ اسے ولید کی پراپرٹی سے ہر صورت شیئر چاہیے تھا۔ جسے وہ انویسٹ کر کے پیسہ بنا سکے۔



فون اس کے ہاتھ سے نیچے جا گرا۔ دونوں ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپنے ایک دم آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرے تھے۔

”بخت!“

ہینری بینجن..... ایک سیاح ہی نہیں تھا، وہ ایک مشہور وی لاگر بھی تھا۔ وہ ان وی لاگرز میں سے تھا جس کے وی لاگرز لاکھوں روپے کماتے تھے اور پھر ایسا کوئی وی لاگر کسی گھر کے بنے کھانے، گھر کی ڈاننگ پر سچے خوان کے بارے میں لاگ بنائے..... اس کی تعریف کرے اور K.W.A کی ویڈیو شیئر کرتے ہوئے اپنا بلاگ لکھے..... تو ادا عبدالمالک کا یوں رونا بنتا تھا۔ Ben کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ دلیم کے مسالاجات کا تناسب تھا۔ وہ اس طرح سے تیار کی گئی تھی کہ ایشین ذائقہ بھی برقرار رہے اور بہت زیادہ اسپائسی بھی نہ ہو..... بین چونکہ ایک سیاح تھا اس لیے وہ کلچر اور فوڈ کی گہری معلومات رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ غیر معروف ہوٹلز میں ٹھہرا کرتا۔ غیر معروف ایجنسیوں کو اپروچ کرتا.....

اس کا ماننا تھا کہ ایسے لوگ اپنا کام زیادہ محنت سے کرتے ہیں بہ نسبت ان کے کہ جن کا ایک نام ہوتا ہے۔ یہ آپ کو اپنا بیسٹ دیں گے۔ بخت ٹریول این ٹور کو سلیکٹ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ بخت نہیں جانتا تھا کہ وہ Ben کو کس حد تک متاثر کر سکے گا کہ وہ اسی کی کمپنی کو چنے، اس کی کمپنی کے ساتھ معاہدہ کرے..... مگر بخت عبد الرحمن اپنا ہوم ورک کرنا جانتا تھا۔ اس نے جتنی تحقیق Ben پر کی تھی، اس سے یہی بات اس کے نوٹس میں آئی تھی کہ وہ نئے تجربے کرنے کا شوقین تھا۔ سو اس نے ایک تیر سے دو شکاریے..... K.W.A کی دلیم بنانے کی ویڈیو وائرل ہونے والی تھی۔ ایک رات میں ہی اسے دس ہزار ویوز مل چکے تھے۔

ادا عبدالمالک کو زندگی اپنا نیا ڈھنگ، نیارنگ دکھانے والی تھی۔

☆.....☆.....☆

”بخت کہاں ہو تم؟“ بابا کا لہجہ گھبرایا ہوا سا انداز لیے ہوئے تھا۔

”آفس سے نکل رہا ہوں، معلوم ہے مجھے موسم خراب ہے اور.....“

”عرشہ زیرو پوائنٹ پر پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی گاڑی کا ٹائر پنچر ہو گیا ہے۔ تم فوراً وہاں پہنچو۔

اس کا نمبر تمہیں بھیج رہا ہوں۔“

اور وہ کیا سمجھا بابا اس کے لیے پریشان تھے۔

بخت نے اک گہری سانس بھری.....

اب یہ کیا تھا؟ اسے نہیں معلوم تھا عرشہ کون تھی..... اور بابا اسے کیسے جانتے تھے۔ بس اب

اسے زیرو پوائنٹ پر پہنچنا تھا۔ چاہے موسم اس سے بھی مزید خراب ہوتا۔

”اف یہ بابا کا..... سوشل ورک.....!“

دسمبر کا مہینہ، تیز برستی بارش..... سبک خرامی سے چلتی ہوا اور وہ ایک انجان لڑکی کو ریسکیو کرنے

جار ہا تھا..... ہا..... بخت عبدالرحمن..... ہا! تمہاری قسمت میں گرم بستر..... بھاپ اڑاتی کافی اور کا جو

کے مزے کہاں.....“ بڑے ہی بوجھل دل سے وہ گاڑی تک آیا تھا۔

(اور آپ کیا سمجھے کہ بخت عبدالرحمن کا موڈ ایسے موسم میں رومانٹک ہونے کا تھا..... تو ٹھہر

جائیے..... آپ ابھی بخت عبدالرحمن کو جانتے نہیں.....)

☆.....☆.....☆

اور جب وہ زیرو پوائنٹ پہنچا..... اس ان دیکھی محترمہ سے رابطہ ہوا تو..... تو وہ محترمہ برستی بارش

میں عین سڑک کے درمیان گاڑی کا ٹائر پنکچر کیے بیٹھی تھیں۔

”یا خدا!“ بخت کے سارے اعضا ایک دم ڈھیلے پڑے تھے۔ اس نے اُف کے سے انداز میں

سراسٹیرنگ سے ٹکایا۔ موسم ہو ٹھنڈ کا..... اور ٹھنڈ بھی ہو دسمبر کے آخر کی..... اور دسمبر بھی اسلام آباد

میں..... تو یقین کیجیے اس موسم میں بھیگنا تارے توڑ لانے سے زیادہ جان جو کھم کا کام ہے۔ اور سامنے

گاڑی میں بیٹھی محترمہ..... نا سمجھی کی کیفیت میں بیٹھی ونڈ اسکرین پر چلتے واپرز کے پار..... اس ابھرتی

دھندلی ہوتی شبیہ کو تکتی تھی کہ آخر وہ جلدی گاڑی سے باہر کیوں نہیں آ جاتا۔ اب بخت عبدالرحمن اسے

کیا بتاتا کہ اسے بارش میں بھیگنے سے کس قدر کوفت ہوتی تھی..... ایک گہری سانس بھر کر، جی کڑا کر کے

وہ گاڑی سے باہر آیا اور پھر جس طرح اس برستی بارش میں گاڑی سڑک کے درمیان سے ہٹا کر سائیڈ پر

کی تھی..... دھکا لگا لگا کر..... وہ ایک الگ داستان تھی۔ محترمہ کی گاڑی لاکڈ کی۔ انہیں اپنی گاڑی میں

بیٹھنے کا اشارہ کیا..... اور خود بھی ایک جاننے والے مکینک کو کال ملاتے ہوئے وہ گاڑی تک آیا۔ اس بارش میں وہ خود تو ٹائر بدلنے والا نہیں تھا۔

”انسان کو گھر سے ویدراپ ڈیس لے کر نکلتا چاہیے۔“ گاڑی کے کھلے دروازے کی طرف سر جھکا کر بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے وہ نصیحت کرنے والے انداز میں بولا تھا۔

”جب فائنل ایئر کا فائنل پیپر ہو تو ویدراپ بارش، طوفان، آندھی جو بھی دکھائے آپ کو اس update کو نظر انداز کر کے گھر سے باہر آنا ہی پڑتا ہے۔“

اس قدر سر اٹھا ہوا، دو ٹوک انداز تھا کہ بخت نے ہاتھ کی حرکت روک کر ایک دم ساتھ بیٹھی محترمہ کو پہلی دفعہ دیکھا۔

ابروؤں کے درمیان ڈھیروں بل، دونوں بازو سینے پر باندھے منہ پر دنیا جہان کی خفگی سجائے وہ ایک 26، 27 سال کی لڑکی تھی۔ اس چہرے کو دیکھ کر بخت عبدالرحمن کو کوئی اور چہرہ بڑی شدت کے ساتھ یاد آیا تھا۔ یا پھر یوں کہیے..... اس چہرے کو دیکھ کر بخت عبدالرحمن کو اک نیا راستہ نظر آیا تھا۔

”اداعبدالما لک! کیا تم زندگی کے آسمان پر اڑان بھرنے کے لیے تیار ہو؟“

☆.....☆.....☆

”آپ اندر آئیے ناں.....“

”نہیں..... مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔“

”ایک کپ چائے کا تو بنتا ہی ہے۔“

”پھر سہی.....“ وہ دونوں ہاتھوں سے اسٹیرنگ تھامے..... ذرا سارخ اس کی جانب کیے اس کے اترنے کا منتظر تھا۔

عرشہ..... ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھے اترنے کو تیار..... اسی کی جانب چہرہ کیے کہہ رہی تھی۔

”ایک منٹ!“

اس کے ”پھر سہی“ کہنے پر وہ ذرا سی متذبذب نظر آئی اور پھر ایک منٹ کہہ کر بیگ سے سیل فون نکالا..... کال ملائی اور..... ”ابو! جن صاحب کو آپ نے مجھے لینے بھیجا تھا۔ وہ اندر نہیں آرہے ہیں..... بعد میں مجھے مت ڈانٹئے گا۔“

اور بخت سر جھکا کر جھٹکتے ہوئے ہنس دیا۔

”واللہ بخت! کوئی تم سا بھی زمین پر اتارا گیا ہے۔“

عرشہ نے فون بند کیا..... اسے دیکھ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

”آپ کے ابو کہہ رہے ہیں کہ آپ مجھے اندر لے کر آئیں..... ورنہ وہ سخت ناراض ہوں گے۔“

بخت کی آنکھوں میں زچ کرنے والی مسکراہٹ تھی۔ عرشہ نے اپنا کھلا منہ بند کیا..... غیر آرام

دہ انداز میں گلا کھنکھارا۔

”بد تمیز.....!“ وہ بڑبڑائی۔

”دیکھیے! آپ کی مرضی نہیں ہے تو آپ جاسکتے ہیں لیکن اس جانے کی ساری ذمہ داری آپ پر ہو

گی۔ میں نے آپ کو اندر آنے کا کہا تھا۔ بس اس بات کی گواہی آپ دے دیجیے گا۔ وہ کیا ہے کہ آپ بہت

تھکے ہوئے دکھ رہے ہیں..... بھگ بھی چکے ہیں۔ تو پھر سہی..... بس ابو کا نزلہ مجھ پر نہ گرے..... اوکے؟“

”یعنی وہ کیا ہے کہ میں بہت تھکی ہوئی آئی ہوں..... آپ اندر چلے گئے تو ساری مہمان داری

مجھے ہی کرنی پڑے گی۔ اور میرا قطعاً ایسا کوئی موڈ نہیں۔“

بخت نے اس کے جملوں کو ڈی کوڈ کیا تھا۔

ایک دفعہ پھر سے اس نے مسکراہٹ روکی..... ان محترمہ کو کیا معلوم کہ وہ یہ تک نہیں جانتا تھا کہ

وہ بابا کے کس دوست کی بیٹی ہے اور وہ اس کی طرف سے یقین دہانی کی منتظر تھی۔

”ٹھیک ہے! نزلہ آپ پر نہیں گرے گا مگر یہ تو بتادیں کہ کن صاحب کا نزلہ آپ پر گرنے نہیں دینا۔“

”جی؟“

”نام کیا ہے آپ کے ابو کا؟“

”ڈاکٹر احتشام الدین.....“

”ڈاکٹر احتشام..... جو بابا کے معالج ہیں؟ ان سے تو مجھے بابا کے بارے میں بہت اہم بات  
ڈسکس کرنی تھی، چلیے..... اندر چلتے ہیں تاکہ آپ کو آپ کے ابو کے نزلہ، زکام، کھانسی سب سے محفوظ  
رکھا جاسکے۔“

عرشہ کا سارا جسم اک دم ڈھیلا پڑا۔ اس نے بڑی بے بسی سے گیٹ کی جانب بڑھتے بخت کو  
دیکھا۔ اس کے امتحان ہو رہے تھے اور اب اوپر سے یہ مہمان داری.....  
”اللہ.....!“ اس نے جھنجھلا کر بڑی خفگی سے آسمان کو دیکھا۔  
”مہمان رحمت ہوتے ہیں۔“ ابو کی آواز کانوں میں گونجی۔

”مجھے یہ والی رحمت ابھی نہیں چاہیے تھی اللہ جی!“ بڑی ہی ناراضی سے شکوہ ہوا.....  
ڈھلکے ہوئے کندھوں کے ساتھ وہ باہر آئی..... بخت نے ریموٹ سے گاڑی کا دروازہ لاک کیا۔  
”اور اگر ابو نے اسے کھانے پر روک لیا تو.....“

اپنی رکی ہوئی سانس اور تھمی ہوئی دھڑکن کے ساتھ اس نے بخت کو دیکھا..... جو بڑی ہی گرم  
جوشی سے اب اس کے ابو سے مل رہا تھا۔

”جاؤ! تمہیں ان بھگے کپڑوں سے ٹھنڈ لگے، تمہیں تاپ چڑھے، نزلہ گرے۔“ عرشہ نے سوچا۔  
”فٹے منہ تمہارا عرشہ خاتون! فٹے منہ تمہارا..... ایسے پیارے بندے کو یوں بددعائیں دیتے  
ہوئے تمہارے دل نے ذرا سی بیٹ بھی مس نہیں کی۔ آہ! عرشہ خاتون! آہ.....! قصور تمہارا نہیں کہ  
M.phil نے تمہارا دماغ حقیقتاً خراب کر رکھا ہے۔“

اس نے خود کو ملامت کی۔

☆.....☆.....☆

”آپ نے سوچا تھا کہ آپ کی ایک کوکنگ ویڈیو یوں راتوں رات وائرل ہوگی؟“  
”نہیں..... قطعاً نہیں۔“ پلین سیاہ ویلوٹ کی لمبی قمیص کے ساتھ کھڑا پاجامہ پہنے، سلیقے سے سر

پر دوپٹا اوڑھے، دائیں کندھے پر گرم خاک کی شال رکھے۔ وہ ایک صوفے پر براجمان بظاہر پرسکون مگر اندر سے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ انٹرویو ریکارڈ کروا رہی تھی۔ زندگی ہر کسی کو ایسے مواقع مہیا نہیں کرتی۔ زندگی صرف انہیں ایسے مواقع مہیا کرتی ہے جو ان تھک کوشش کرتے ہیں، دل نہیں چھوڑتے..... مایوس ہوں بھی تو پھر سے ہمت یکجا کر کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ کہہ رہی تھی۔

”میں نے یہ کام اپنی مرضی سے شروع ہی نہیں کیا تھا..... یہ کام مجھ سے کروایا گیا..... سب کی زندگیوں میں اچھا برا وقت آتا رہتا ہے..... زندگی کے ایسے ہی کسی برے وقت سے گزرتے ہوئے..... مجھ سے کسی نے کروایا..... کسی نے چراغ لے کر راستہ ضرور دکھایا مگر انگلی پکڑ کر چلایا نہیں..... اس نے مجھے سکھایا کہ کیسے phoenix دوبارہ جنم لیتا ہے اپنے ہی وجود کی راہ سے.....“

(وہ ایک podcast تھی)

”سوری، میں آپ کی بات کاٹ رہا ہوں..... لیکن میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ ”کسی“ کون ہے؟“

”جی..... پوچھ سکتے ہیں..... ضرور پوچھ سکتے ہیں..... بلکہ میں نے ذکر ہی یوں کیا ہے کہ آپ مجھ سے پوچھیں.....“ یہ جواب دیتے ہوئے ادا کے چہرے پر کلیوں سی مسکراہٹ تھی۔

”بخت عبدالرحمن..... بخت ٹریول این ٹور کے اوزر ہیں۔ میرے فرسٹ کزن ہونے کے ساتھ ساتھ میرے mentor، میرے دوست ہیں۔ جو لوگ ٹریولنگ کے، سیاحت کے شوقین ہیں ان کے لیے بخت عبدالرحمن کا نام غیر معروف نہیں ہے۔ یوٹیوب چینل سے لے کر یہ کام کیسے کرنا ہے..... ویڈیوز کیسے اور کس طرح کی بنانی ہیں اور سب سے بڑھ کر اس سارے کام میں ”صبر“ کا دامن کیسے پکڑے رکھنا ہے۔ یہ سب مجھے اس شخص نے سکھایا ہے۔“

”اس تعلق کی نوعیت پوچھ سکتا ہوں.....؟“

”بالکل پوچھ سکتے ہیں علی.....“ گھٹنوں اور ٹخنوں کو ایک ساتھ جوڑے، ٹانگیں ترچھی کیے.....

”کمر بالکل سیدھی کی kitten ہیلز پہنے..... دونوں ہاتھ گود میں رکھے وہ اب پہلے سے بہت پر اعتماد تھی اور جب ہوسٹ علی زمان اس سے اس تعلق کی نوعیت پوچھتا تھا وہ ذرا سی دیر کو تھم گئی..... سر جھکا کر مسکرائی اور پھر سر اٹھا کر ہوسٹ کو دیکھا۔“

”ہر تعلق کی نوعیت وہ نہیں ہوتی..... جو آپ لوگ، معاشرہ سمجھتا ہے اور اس وقت میرے منہ سے سننا چاہتا ہے۔ کچھ تعلق اتنے خوب صورت، اتنے پاکیزہ، اس قدر شفاف ہوتے ہیں کہ ان کی نوعیت بدلنے کا سوچ کر بھی آپ کو خوف لاحق ہوتا ہے..... کہیں یہ خوب صورتی کھونہ جائے..... بخت عبدالرحمن میرے کزن mentor اور دوست ہیں..... اور میرے لیے یہ تعلق سب سے بڑھ کر ہے۔“

”ٹھیک ہو گیا..... آپ نے ابھی ایک ٹراما کا ذکر کیا..... بتانا چاہیں گی کہ کیا ہوا تھا؟“

”نہیں.....!“

”کیوں.....؟“

"It's personal."

”آپ آج ایک podcast میں انٹرویو دے رہی ہیں..... آپ لوگوں کے نوٹس میں آئی ہیں..... آپ کا نام سننے کی ابتدا ہے یہ..... لوگ آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننا چاہیں گے..... پھر؟“

”تو جتنا میں ضروری سمجھتی ہوں..... ضروری سمجھوں گی ضرور شیئر کروں گی..... بلکہ کرتی بھی ہوں..... لوگ میری ویڈیوز میں میرا کچن، میرا گھر دیکھ سکتے ہیں..... میرا کام کھانا بنانا ہے تو ویڈیوز اسی کے متعلق ہوں گی نہ کہ میری ذاتیات کے متعلق.....“

”یعنی آپ likes لینے کے لیے کچھ ایسا نہیں کریں گی؟“

”کروں گی ناں!“

”کیا.....؟“

”کھانا بناؤں گی.....“

اور وہاں ہوسٹ کا قہقہہ گونجا اور اداہلکے سے ہنس دی۔

تو ادا عبدالمالک زندگی کے آسمان پر اڑان بھرنے کی شروعات کر چکی تھی..... وہ اپنی پہلی سولو پرواز لے چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس کے فون پر پیغامات کی مخصوص رنگ ٹون بجی اور اس سے پہلے کہ وہ پیغامات کھول کر دیکھتا..... کال آنی شروع ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام!“ آج بخت کا لہجہ پھیکا سا تھا۔

”کچھ بھیجا ہے آپ کو.....“

”ہاں.....! دیکھنے ہی لگا تھا۔“

”کھول کر دیکھیں ذرا جلدی سے.....“

”فون بند کرو گی تو دیکھوں گا ناں.....!“

اور وہ ہنس دی۔ ادا نے اپنے جوش میں اس کا بجھا ہوا انداز نوٹس ہی نہیں کیا تھا اور جب اس نے چیٹ کھولی تو آگے سے چند clips تھے..... ابھی انٹرویو آن ایئر نہیں گیا تھا۔ پروموشن کے لیے اسے چند کلپس بھیجے گئے تھے۔ بخت ایک دم حیران ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ویڈیو وائرل ہوئی ہے مگر نوبت انٹرویو تک جا پہنچی تھی، اس کا بخت کو اندازہ نہیں تھا۔ کہیں پر اس کی مسکراہٹ تھی۔ کہیں اس کا پر مزاح انداز..... کہیں دو ٹوک جواب..... کتنی ہی دیر وہ ویڈیوز کو بار بار پیچھے کر کے دیکھتا رہا..... خوشی کے ساتھ اندر کہیں بہت اندر گھلتا ہوا کوئی غم تھا..... جیسے پانی میں رکھی نمک کی ڈلی..... وہ یک دم کوئی رد عمل دکھا نہیں سکا تھا۔

”تم نے مجھے حیران کیا ادا..... مجھے یوں حیران کر دینے کے لیے شکریہ! اس سے زیادہ پر لطف اور کچھ ہو نہیں سکتا.....“

چند لمحوں بعد اس نے پیغام ٹائپ کر کے بھیجا۔ فون سائلنٹ پر لگا کر سائیڈ پر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔

اسے دیکھنا تھا کہ نمک کی ڈلی کب تک پوری کی پوری پانی میں گھلتی ہے۔

☆.....☆.....☆

اس نے لمبے گھنگریالے بالوں کو کھلا چھوڑ کر پشت پر گرایا۔ سیاہ آنکھوں میں بھر بھر کا جل ڈالتے ہوئے مسکارے سے پلکوں کو سجاتے ہوئے اس کے پورے وجود میں خموشی بڑے زور سے گونجتی تھی nude pink شیڈ کی لپ اسٹک لگاتے ہوئے اس نے اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دیا تھا۔

کل جب وہ سارے لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو کال آئی تھی۔

کمرے میں تارا بھی تھی جو منہ ہاتھ دھو کر محض لپ اسٹک لگا کر تیار ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تارا اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ان نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے جھک کر ہیلز پہنیں، شیفون کا دوپٹا گلے میں ڈالا۔ شال کوشانوں پر پلیٹ کر دونوں بازوؤں پر ڈالا تھا۔ گردن اٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھا۔ بل کھاتی ایک لٹ کالر بون کو چھو رہی تھی۔ وہ کس قدر پر اعتماد، نفیس اور خوب صورت دکھتی تھی..... اور اسے پوری تقریب میں ایسا ہی دکھنا تھا۔ پرفیوم اٹھا کر گردن اور کلائیوں پر اسپرے کیا۔ مڑ کر الماری سے ایک گفٹ نکال کر بیگ میں رکھا اور تارا سے کہا۔

”جاؤ دیکھو! امی ابو تیار ہیں؟“

”وہ تو کب کے تیار ہو کر لاؤنج میں بیٹھے ہیں۔ آپ کی تیاری ہی ختم نہیں ہو رہی۔“

تارا ایک تیز نظر اس پر ڈال کر اٹھ گئی۔ کل آنے والی کال عبدالمالک نے سنی تھی۔

سن کر وہ اتنے خموش ہو گئے تھے کہ وہ سب چونک گئے۔

”کیا ہوا ہے؟ خیریت ہے؟“ رقیہ نے پوچھا اور انہوں نے نظریں اٹھا کر ادا کو دیکھا۔

انہوں نے جو کہا اسے سن کر رقیہ جو چونک کر ایک دم آگے ہو کر بیٹھی تھیں، ڈھے کر صوفے کی پشت سے جا لگیں۔ تارا نے ہاتھ سے اپنے کھلے منہ کو ڈھانپا اور ادا..... وہ اتنی خاموش تھی کہ خاموشی اپنے پورے معنوں کے ساتھ اس کے وجود میں گونجتی تھی۔

☆.....☆.....☆

سفید پردے برابر..... ایک سی فال کے ساتھ گرے ہوئے تھے۔ جن کے آگے گولڈن فریم پر سفید اور پنک پھولوں کے ساتھ بائل گرین پتیوں کی زیبائش تھی۔ اس پھولوں سے سجے فریم کے آگے

سفید ہی کا وچ پڑا تھا۔ انتظام اوپن ایئر میں تھا۔ سبزہ زار میں جا بجا مہمانوں کے لیے سفید صوفے لگے ہوئے تھے۔

آنکھوں پر گاگلز لگائے وہ اسٹیج کے سب سے قریبی صوفے پر براجمان تھی۔ گردن موڑے وہ کپل کو دیکھ رہی تھی۔

وہ سفید شلوار سوٹ کے اوپر واسکٹ پہنے اپنی killing dapper look کے ساتھ موجود تھا۔ عرشہ ٹی پنک کا مدار گھیر والی میکسی میں ملبوس تھی۔ لمبے dyed بالوں میں لوز کرلز تھے جو گردن کے دونوں اطراف سے شانوں پر گرے ہوئے تھے۔ گلے میں صرف ایک نیکلکس تھا، کانوں میں اسٹڈز، ایک کلانی پر گھڑی اور دوسری کلانی خالی تھی۔ عام دلہنوں کے برعکس اس کے ماتھے پر سلوٹیں تھیں۔ ہونٹ خفگی کے سے انداز میں بھنچے ہوئے تھے۔

تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔ بخت کے ساتھ عبدالرزاق اور عرشہ کے ساتھ ڈاکٹر احتشام آکر بیٹھے تھے۔ ماں کی وفات ہو چکی تھی۔

عبدالرزاق نے اسے انگوٹھی پکڑائی..... نہ جانے کس احساس کے تحت اس نے انگوٹھی کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس نے سامنے دیکھا اور پھر اپنی بند مٹھی کو..... ہاتھ کی ہتھیلی میں کچھ زور سے چبھا تھا۔ نہ صرف ہاتھ میں اس کے دل میں بھی کچھ شدت سے چبھا تھا۔

”وہ کیا تھا؟ کوئی احساس یا پھر..... محبت؟“

وہ محبت تھی، ہے اور رہے گی..... وہ جانتا تھا۔ اس کسک کو..... اس چھن کو اس نے خود اپنے لیے چنا تھا۔ اس نے خود خار چنے تھے، اس نے خود اپنی راہ مشکل بنائی تھی۔ اس نے نظریں موڑ لیں۔ اس کے حلق سے کچھ نیچے اتر اور پھر اس نے انگوٹھی عرشہ کو پہنادی۔

تالیوں کا شور گونجا اور اسی شور میں عرشہ نے بھی رنگ پہنائی تھی۔ ایک گہری سانس بھر کر اس نے مسکرا کر سامنے بیٹھے باپ کو دیکھا..... عبدالرزاق کی آنکھیں نم تھیں۔ اور پھر انہوں نے ایک دم اسے گلے سے لگا کر ماتھا چوم لیا تھا۔

اس قدر ضبط، اتنا تحمل..... اتنی برداشت..... اتنا بولڈ فیصلہ.....!

واللہ! بخت عبدالرحمن..... واللہ.....! تم کیا کھاتے ہو؟ اور پھر جب مہمان باری باری اپنے گفتگو اور خیر خواہی کے کلمات سے نئے بننے والے کپل کو نواز رہے تھے۔ اس نے ایک دم اپنی جگہ چھوڑی..... شال کو کونے سے پکڑ کر کندھے کے گرد لپیٹا..... لبوں پر مسکراہٹ سجائے..... گردن اٹھائے..... وہ اسٹیج کی طرف بڑھی۔

اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر بخت عبدالرحمن کے جبرے بھنچ گئے۔ یوں محسوس ہوا کہ کوئی جسم کی تمام رگوں کو کھینچ رہا ہے..... یہ دوسرا مشکل ترین مرحلہ تھا۔  
”مبارک ہو.....!“ اس نے مسکرا کر بخت سے کہا۔

سر کو خم دے کر اس نے ایک گفٹ پیک کھولا۔ وہ ایک بریسلٹ تھا۔ جھک کر بریسلٹ عرشہ کی کلائی میں پہناتے ہوئے اس نے کہا۔

”میری دلی دعا ہے کہ یہ رشتہ آپ کے لیے خیر کا باعث ہو..... آپ نے ایک بہت اچھے شخص کا انتخاب کیا ہے۔“

بخت کے کانوں نے وہ جملہ سنا..... اس کے ناک کے نتھنوں سے ہوتی ہوئی مرچ جیسی کوئی چیز لہر کی صورت میں پورے جسم میں پھیلی۔

دونوں نے بیک وقت سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور فوٹو گرافر نے یہ لمحہ ہمیشہ کے لیے قید کر لیا تھا۔



ناول **میرا بخت** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **10** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔